الحاد جدید کے مغربی اور مسلم دنیا پر اثرات

محمد مبشر نذیر

مغربی اور مسلم معاشروں پر الحاد کے اثرات: الحاد کے اس عروج نے مغربی اور مسلم معاشروں پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ انھوں نے قدیم ورثے کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا اور عیسائیت اور اسلام کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج پیدا کر دیا۔ ہم الحاد کے اثرات کو نظریات، فلسفے، سیاست، معیشت، معاشرت اور اخلاق، ہر پہلو میں نمایاں طور پر محسوس کر سکتے ہیں۔

عقائد، فلسفہ اور نظریات: سب سے پہلے ہم نظریاتی اور فلسفیانہ پہلو کو لیتے ہیں۔ الحاد نے عیسائیت اور اسلام کے بنیادی عقائد یعنی وجود باری تعالیٰ، رسالت اور آخرت پر حملہ کیا اور اس کے بارے میں شکوک وشبہات پھیلائے۔ خدا کے وجود سے انکار کر دیا گیا، رسولوں کے تاریخی وجود ہی کا انکار کر دیا گیا اور آخرت سے متعلق طرح طرح کے سوالات اٹھائے گئے۔ اس ضمن میں ملحدین کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی، کیونکہ یہ تینوں عقائد مابعد الطبیعیاتی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں جسے اس دنیا کے مشاہداتی اور تجرباتی علم کی روشنی میں نہ تو ثابت کیا جا سکتا ہے اور نہ رد کیا جا سکتا ہے۔ ان ملحدین نے عیسائیت پر ایک اور طرف سے بڑا حملہ کیا اور وہ یہ تھا کہ قرون وسطیٰ کے عیسائی علما نے اپنے وقت کے کچھ سائنسی اور فلسفیانہ نظریات کو اپنے نظام عقائد (Theology) کا حصہ بنا لیا تھا جیسے زمین کائنات کا مرکز ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ جب جدید سائنسی تحقیقات سے یہ نظریات غلط ثابت ہوئے تو بہت سے لوگوں کا پوری عیسائیت پر سے اعتماد اٹھ گیا اور انھوں نے فکری طور پر بھی الحاد کو اختیار کر لیا۔ اسلام میں چونکہ اس قسم کے کوئی عقائد نہیں، لہٰذا اسلام اس قسم کے حملوں سے محفوظ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ الحاد کو مغرب میں تو بہت سے ایسے پیروکار مل گئے جو ہر قسم کے مذہب سے بےزاری کا اعلان کر کے خود کو فخریہ طور پر ملحد (Atheist) کہتے ہیں، لیکن مسلمانوں میں انھیں ایسے پیروکار بہت کم مل سکے۔ مسلمانوں میں صرف ایسے چند لوگ ہی پیدا ہوئے جو عام طور پر کمیونسٹ پارٹیوں میں شامل ہوئے۔ اگر ہم کمیونسٹ تحریک سے وابستہ نسلی مسلمانوں کا جائزہ لیں تو ان میں سے بھی بہت کم ایسے ملیں گے جو خود کو کھلم کھلا دہریہ یا ملحد کہلوانے پر تیار ہوں۔

عیسائیت پر ملحدین کا ایک اور بڑا حملہ یہ تھا کہ انھوں نے انبیائے کرام، بالخصوص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود سے انکار کر دیا۔ انھوں نے آسمانی صحیفوں بالخصوص بائبل کو قصے کہانیوں کی کتاب قرار دیا۔ اس الزام کا کامیاب دفاع کرتے ہوئے کچھ عیسائی ماہرین آثار قدیمہ نے اپنی زندگیاں وقف کر کے علمی طور پر یہ بات ثابت کر دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک تاریخی شخصیت ہیں اور بائبل محض قصے کہانیوں کی کتاب ہی نہیں، بلکہ اس میں بیان کیے گئے واقعات تاریخی طور پر مسلم ہیں اور ان کا ثبوت آثار قدیمہ کے علم سے بھی ملتا ہے۔ یہ الحاد کے مقابلے میں عیسائیت کی بہت بڑی فتح تھی۔ اسلام کے

معاملے میں ملحدین ایسا نہ کر سکے کیونکہ قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی حیثیت کو چیلنج کرنا ان کے لیے علمی بددیانتی کے شکار افراد نے چند من گھڑت روایات کا سہارا لے کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی کردار پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس میں بری طرح ناکام ہوئے، کیونکہ ان من گھڑت روایات کی علمی و تاریخی حیثیت کو مسلم علما نے احسن انداز میں واضح کر دیا جسے انصاف پسند ملحد محققین نے بھی تسلیم کیا۔ ان محققین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ خدا کی ذات کے متعلق جو شکوک و شبہات ان ملحدین نے پھیلائے تھے، اس کی بنیاد چند سائنسی نظریات پر تھی۔ بیسویں صدی کی سائنسی تحقیقات جو خود ان ملحدین کے ہاتھوں ہوئیں، نے یہ بات واضح کر دی کہ جن سائنسی نظریات پر انھوں نے اپنی عمارات تعمیر کی تھی، بالکل غلط ہیں۔ اس طرح ان کی وہ پوری عمارت اپنی بنیاد ہی سے منہدم ہو گئی جو انھوں نے تعمیر کی تھی۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کر رہے ہیں۔

سیاست: فکری اور نظریاتی میدان میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ الحاد اسلام کے مقابلے میں ناکام رہا، مگر عیسائیت کے مقابلے میں اسے جزوی فتح حاصل ہوئی، البتہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی میدانوں میں الحاد کو مغربی اور مسلم دنیا میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ سیاسی میدان میں الحاد کی سب سے بڑی کامیابی سیکولرازم کا فروغ ہے۔ پوری مغربی دنیا اور مسلم دنیا کے بڑے حصے نے سیکولرازم کو اختیار کر لیا۔ سیکولرازم کا مطلب ہی یہ ہے کہ مذہب کو گرجے یا مسجد تک محدود کر دیا جائے اور کاروبار زندگی کو خالصتاً انسانی عقل کی بنیاد پر چلایا جائے جس میں مذہبی تعلیمات کا کوئی حصہ نہ ہو۔ مغربی دنیا نے تو سیکولرازم کو پوری طرح قبول کر لیا اور اب اس کی حیثیت ان کے ہاں ایک مسلمہ نظریے کی ہے۔ انھوں نے اپنے مذہب کو گرجے کے اندر محدود کر کے کاروبار حیات کو مکمل طور پر سیکولر کر لیا ہے۔ چونکہ اہل مغرب کے زیر اثر مسلمانوں کی اشرافیہ بھی الحاد کے اثرات کو قبول کر چکی تھی، اس لیے ان میں سے بھی بہت سے ممالک نے سیکولرازم کو بطور نظام حکومت کے قبول کر لیا۔ بعض ممالک جیسے ترکی اور تیونس نے تو اسلام سے کھلم کھلا بغاوت کا اعلان کیا، لیکن مسلم ممالک کی اکثریت نے سیکولرازم اور اسلام کا ایک ملغوبہ تیار کرنے کی کوشش کی جس میں بالعموم غالب عنصر سیکولرازم کا تھا۔

الحاد کو فروغ جمہوریت کے نظریے سے بھی ہوا۔ اگرچہ جمہوریت عملی اعتبار سے اسلام کے مخالف نہیں، کیونکہ اسلام میں بھی آزادی رائے اور شوریٰ کی بڑی اہمیت ہے، لیکن جمہوریت جن نظریاتی بنیادوں پر قائم ہے، وہ خالصتاً ملحدانہ ہے۔ جمہوریت کی بنیاد حاکمیت جمہور کے نظریے پر قائم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عوام کی اکثریت خدا کی مرضی کے خلاف فیصلہ دے دے تو ملک کا قانون بنا کر اس فیصلے کو نافذ کر دیا جائے۔ اس کی واضح مثال ہمیں اہل مغرب کے ہاں ملتی ہے، جہاں اپنے دین کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے انھوں نے فری سیکس، ہم جنس پرستی، شراب اور سود کو حلال کر لیا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں اس کی مثال شاید ترکی ہی میں مل سکتی ہے۔ اسلام نظریاتی طور پر جمہوریت کے مغربی تصور کا شدید مخالف ہے۔ اسلام کے مطابق حاکمیت اعلیٰ جمہور کا حق نہیں، بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اسلام کی نظر میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنا شرک ہے۔ سب سے بڑا اقتدار (Sovereignty) صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اس کے برعکس جہاں اللہ تعالیٰ نے کوئی ہدایت نہیں دی، وہاں عوام کی اکثریتی رائے اور مشورے سے فیصلہ کیا جانا چاہیے۔ اکثریت کی مرضی کے خلاف اس پر اقلیتی رائے کو مسلط کرنا اسلام میں درست نہیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو حکم دیتا ہے کہ

وہ ہر معاملہ مشورے سے طے کریں۔

معیشت: معیشت کے باب میں الحاد نے دنیا کو دو نظام دیے۔ان میں سے ایک ایڈم اسمتھ کا سرمایہ دارانہ نظام یا کیپٹل ازم اور دوسرا کارل مارکس کی اشتراکیت یا کمیونزم۔ کیپٹل ازم دراصل جاگیردارانہ نظام (Feudalism) ہی کی ایک نئی شکل ہے جو نسبتاً جاگیردارانہ نظام سے کچھ بہتر ہے۔ کیپٹل ازم میں مارکیٹ کو مکمل طور پر آزاد چھوڑا جاتا ہے جس میں ہر شخص کو یہ آزادی ہوتی ہے کہ وہ دولت کے جتنے چاہے انبار لگالے۔جس شخص کو دولت کمانے کے لامحدود مواقع میسر ہوں، وہ امیر سے امیر تر ہوتا جائے گا اور جسے یہ مواقع میسر نہ ہوں، وہ غریب سے غریب تر ہوتا چلا جائے گا۔حکومت اس سلسلے میں کوئی مداخلت نہیں کرتی۔ جاگیردارانہ نظام کی طرح اس نظام میں بھی سرمایہ دار، غریب کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اس کا استحصال کرتا ہے۔غریب اور امیر کی خلیج اتنی زیادہ ہوجاتی ہے کہ ایک طرف گھی کے چراغ جلائے جاتے ہیں اور دوسری طرف کھانے کو دال بھی میسر نہیں ہوتی۔ایک طرف ایک شخص ایک وقت کے کھانے پر ہزاروں روپے خرچ کر دیتا ہے اور دوسری طرف ڈسپرین خریدنے کی رقم بھی نہیں ہوتی۔ ایک طرف بچوں کو تعلیم کے لیے ترقی یافتہ ممالک کی یونی ورسٹیوں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں اور دوسری طرف بچوں کو سرکاری اسکول میں تعلیم دلانے کے لیے بھی ماں باپ کو فاقے کرنا پڑتے ہیں۔ایک طرف محض ایک لباس سلوانے پر لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں اور دوسری طرف استعمال شدہ کپڑے خریدنے کے لیے بھی پیٹ کاٹنا پڑتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اس تفاوت کی مکمل ذمہ داری الحاد پر ہی نہیں ڈالی جاسکتی، کیونکہ اس کا پیش رو نظام فیوڈل ازم، جو کہ اس سے بھی زیادہ استحصالی نظام ہے، اس دور میں ارتقا پذیر ہوا جب مغربی دنیا میں عیسائی علما اور مسلم دنیا میں مسلم علما طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عیسائی تھیوکریسی نے جاگیردارانہ نظام کے ظلم وستم اور استحصال کے خلاف کبھی موثر جدوجہد نہیں کی، بلکہ اپنے ادیان کی تعلیمات کے برعکس وہ اس کے سرپرست بنے رہے۔ اٹھارویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد فیوڈل ازم کی کوکھ سے کیپٹل ازم نے جنم لیا جو کہ امیر کے ہاتھوں غریب کے استحصال کا ایک نیا نظام تھا، لیکن اس کا استحصالی پہلو فیوڈل ازم کی نسبت کم تھا، کیونکہ وہاں تو بہتر مستقبل کی تلاش میں غریب کسی اور جگہ جا بھی نہیں سکتا۔ چونکہ اہل مغرب اور اہل اسلام اپنے دین کی تعلیمات سے خاصے دور ہوچکے تھے، اس لیے یہ نظام اپنے پورے استحصالی رنگ میں پنپتا رہا۔ یورپ میں کارل مارکس نے کیپٹل ازم کے استحصال کے خلاف ایک عظیم تحریک شروع کی جس میں اس نظام کی معاشی ناہمواریوں پر زبردست تنقید کی گئی۔ مارکس اور ان کے ساتھی فریڈرک اینجلز، جو بہت بڑے ملحد فلسفی تھے، نے پوری تاریخ کی ایک نئی تشریح (Interpretation) کی جس میں انھوں نے معاش ہی کو انسانی زندگی اور انسانی تاریخ کا محور مرکز قرار دیا۔ان کے نزدیک تاریخ کی تمام جنگیں، تمام مذاہب اور تمام سیاسی نظام معاشیات ہی کی پیداوار تھے۔انھوں نے خدا، نبوت اور آخرت کے عقائد کا انکار کرتے ہوئے دنیا کو ایک نیا نظام پیش کیا جسے تاریخ میں کمیونزم کے نام سے یاد رکھا جائے گا۔کمیونزم کا نظام خالصتاً الحادی نظام تھا۔

کمیونسٹ نظام انفرادی ملکیت کی مکمل نفی کرتا ہے اور تمام ذرائع پیداوار، جن میں زراعت، صنعت، کان کنی اور تجارت شامل ہیں، کو مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول میں دے دیتا ہے۔ پوری قوم ہر معاملے میں حکومت کے فیصلوں پر عمل کرتی ہے جو

کہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ کمیونسٹ جدوجہد پوری دنیا میں پھیل گئی۔ اسے سب سے پہلے کامیابی روس میں ہوئی جہاں لینن کی قیادت میں ۱۹۱۷ء میں کمیونسٹ انقلاب برپا ہوا اور دنیا کی پہلی کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی۔ دوسرا بڑا ملک جس نے کمیونزم کو قبول کیا، چین تھا۔ باقی ممالک نے کمیونزم کی تبدیل شدہ صورتوں کو اختیار کیا۔ کمیونزم کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اس میں فرد کے لیے محرک (Incentive) نہیں ہوتا جس سے وہ اپنے ادارے کے لیے اپنی خدمات کو اعلیٰ ترین انداز میں پیش کر سکے اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت کر سکے۔ اس کے برعکس کیپٹل ازم میں ہر شخص اپنے کاروبار کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے اور اس سے زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لیے دن رات محنت کرتا ہے اور اپنی اعلیٰ ترین صلاحیتیں استعمال کرتا ہے۔ کمیونزم کی دوسری بڑی خامی یہ تھی کہ پورے نظام کو جبر کی بنیادوں پر قائم کیا گیا اور شخصی آزادی بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سوویت یونین کی معیشت کمزور ہوتی گئی اور بالآخر ۹۱-۱۹۹۰ء میں یہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی۔ اس کے بعد اسے کیپٹل ازم ہی کو اپنانا پڑا۔ دوسری طرف چین کی معیشت کا حال بھی پتلا تھا۔ چین نے اپنی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے کمیونزم کو خیر باد کہہ دیا اور تدریجاً اپنی مارکیٹ کو اوپن کیپٹل ازم کو قبول کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کیپٹل ازم اور کمیونزم، دونوں نظام ہائے معیشت ہی استحصال پر مبنی نظام ہیں۔ ایک میں امیر غریب کا استحصال کرتا ہے اور دوسرے میں حکومت اپنے عوام کا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اہل مغرب نے اعلیٰ ترین اخلاقی اصولوں کو اپنا کر کیپٹل ازم کے استحصالی نقصانات کو کافی حد تک کم کر لیا ہے، لیکن تیسری دنیا جس کی اخلاقی حالت بہت کمزور ہے، وہاں اس کے نقصانات کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ چونکہ یہاں ہم الحاد کی تاریخ کا مطالعہ کر رہے ہیں، اس لیے یہ کہنا مناسب ہو گا کہ پچھلی تین صدیوں میں معیشت کے میدان میں الحاد کو دنیا بھر میں واضح برتری حاصل رہی ہے اور دنیا نے الحاد پر قائم دو نظام ہائے معیشت یعنی کیپٹل ازم اور کمیونزم کا تجربہ کیا ہے۔ کمیونزم تو اپنی عمر پوری کر کے تاریخ کا حصہ بن چکا ہے، اس لیے اس پر ہم زیادہ بحث نہیں کرتے، لیکن کیپٹل ازم کے چند اور پہلوؤں کا ایک مختصر جائزہ لینا ضروری ہے جو انسانیت کے لیے ایک خطرہ ہیں۔

کیپٹل ازم کے نظام کی بنیاد سود پر ہے۔ بڑی بڑی صنعتوں کے قیام اور بڑے بڑے پراجیکٹس کی تکمیل کے لیے وسیع پیمانے پر فنڈز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک سرمایہ دار کے لیے اتنی بڑی رقم کا حصول بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر اس کے پاس اتنی رقم موجود بھی ہو تو اسے ایک ہی کاروبار میں لگانے سے کاروباری خطرہ یا رسک بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ ایک کاروبار اگر ناکام ہو جائے تو پوری کی پوری رقم ڈوبنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اگر وہی رقم تھوڑی تھوڑی کر کے مختلف منصوبوں میں لگائی جائے تو ایک منصوبے کی ناکامی سے پوری رقم ڈوبنے کا خطرہ نہیں ہوتا اور تمام کے تمام منصوبوں کے ڈوبنے کا خطرہ بھی نہیں ہوتا۔ اسے علم مالیات (Finance) کی اصطلاح میں Diversification کہا جاتا ہے۔ ان بڑے بڑے پراجیکٹس کے لیے رقم کی فراہمی کے لیے دنیا نے Financial Intermediaries کا نظام وضع کیا ہے۔ اس درمیانی واسطے کا سب سے بڑا حصہ بینکوں پر مشتمل ہے۔ یہ بینک عوام الناس کی چھوٹی چھوٹی بچت کی رقوم کو اکٹھا کرنے کا کام کرتے ہیں جس پر بینک انھیں سود ادا کرتا ہے۔ پورے ملک کے لوگوں کی تھوڑی تھوڑی بچتوں کو ملا کر بہت بڑی تعداد میں فنڈ اکٹھا کر لیا جاتا ہے جو انھی سرمایہ داروں کو کچھ زیادہ شرح سود پر دیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر بینک عوام کو 80% سود کی ادائیگی کر رہا ہے

تو سرمایہ دار سے 10% سود وصول کر رہا ہوگا۔ اس 2% میں بینک اپنے انتظامی اخراجات پورے کر کے بہت بڑا منافع بھی کما رہا ہوتا ہے۔ سرمایہ دار عموماً اپنے سرمایے کو ایسے کاروبار میں لگاتے ہیں جو اس سرمایے پر بہت زیادہ منافع دے سکے۔ اگر ہم دنیا بھر کی مختلف کمپنیوں کے سالانہ اکاؤنٹس (Annual Accounts) کا جائزہ لیں تو ہمیں اس میں ایسے کاروبار بھی ملیں گے جن میں سرمایہ پر منافع (Return on Capital Employed) کی شرح 50% سالانہ، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوگی۔ اس منافع کا ایک معمولی سا حصہ بطور، سود ان غریب لوگوں کے حصے میں بھی آتا ہے جن کا سرمایہ دراصل کاروبار میں لگا ہوتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھ لیجیے کہ بالفرض ایک سرمایہ دار کسی بینک سے ایک ارب روپے 10% سالانہ شرح سود پر لیتا ہے اور اس سرمائے سے پچاس کروڑ روپے سالانہ نفع کماتا ہے۔ اس میں سے وہ دس کروڑ بینک کو بطور سود ادا کرے گا اور بینک اس میں 8% سالانہ کے حساب سے آٹھ کروڑ روپے اپنے کھاتہ داروں (Depoist Holders) کو ادا کرے گا۔ چونکہ یہ کھاتہ دار بہت بڑی تعداد میں ہوں گے جنھوں نے اپنی تھوڑی تھوڑی بچت بینک میں جمع کروائی ہوگی، اس لیے ان میں سے ہر ایک حصے میں چند ہزار یا چند سو روپے سے زیادہ نہیں آئے گا۔ اس طریقے سے سرمایہ دار، عام لوگوں کو چند ہزار روپے پر ٹرخا کر ان کا پیسہ استعمال کرتا ہے اور اسی پیسے سے خود کروڑوں روپے بنالیتا ہے۔ اس مثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جس طرح جاگیردارانہ نظام میں جاگیردار یا مہاجن غریبوں کو سود پر رقم دے کر ان کا استحصال کیا کرتا تھا، اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار غریبوں سے سود پر رقم لے کر ان کا استحصال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ فیوڈل ازم کے مہاجنی سود کا سلسلہ بھی اس نظام میں پوری طرح جاری ہے جس میں کریڈٹ کارڈز کے ذریعے Micro-Financing کا سلسلہ جاری ہے۔ اس معاملے میں 36% سالانہ کے حساب سے سود بھی وصول کیا جارہا ہے۔ اس سود میں سے صرف 10%-8 اپنے کھاتہ داروں کو ادا کیا جارہا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی ایک اور خصوصیت جوئے کا فروغ ہے۔ یہ لعنت فیوڈل ازم میں بھی اسی طرح پائی جاتی تھی۔ دنیا بھر میں جوا کھیلنے کے بڑے بڑے ادارے قائم کیے جاچکے ہیں۔ اسٹاک ایکسچینج، فاریکس کمپنیز اور بڑی بڑی کیپٹل اور منی مارکیٹس ان کیسینوز کے علاوہ ہیں جہاں بڑی بڑی رقوم کا سٹہ کھیلا جاتا ہے۔ کھربوں روپے سٹے میں برباد کردیے جاتے ہیں، مگر بھوک سے مرنے والے بچوں کا کسی کو خیال نہیں آتا۔ ان کیسینوز میں جوئے کے ساتھ ساتھ بے حیائی اور بدکاری کو بھی فروغ مل رہا ہے، بلکہ دنیا بھر میں سیاحت کو فروغ دینے کے لیے جوئے اور بدکاری کے مراکز بھی قائم کیے جاچکے ہیں۔ سود اور جوا ایسی برائیاں ہیں جن کا تعلق الحاد کی اخلاقی بنیادوں سے قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

اخلاق اور معاشرت: الحاد کے اثرات سے جو چیز سب سے زیادہ متاثر ہوئی ہے، وہ اخلاق انسانی اور نظام معاشرت ہے۔ اگر کوئی یہ مان لے کہ اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے، موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے جہاں اسے اپنے کیے کا حساب دینا ہوگا تو پھر سوائے حکومتی قوانین یا معاشرتی دباؤ کے کوئی چیز دنیا میں اسے کسی برائی کو اختیار کرنے سے نہیں روک سکتی۔ پھر اس کی زندگی کا مقصد اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ دولت اور اس سے لطف اندوز ہونا ہی رہ جاتا ہے۔ اگر اسے یقین ہو کہ کوئی اسے نہیں پکڑ سکتا تو پھر کیا حرج ہے کہ وہ اپنے کسی بوڑھے رشتے دار کی دولت کے حصول کے لیے اس کو زہر دے دے؟ اگر وہ اتنا ہوشیار ہو کہ پولیس اس کا سراغ نہیں لگاسکتی ہو تو پھر لاکھوں روپے کے حصول کے لیے چند بم دھماکے کر کے دہشت گرد

بننے میں کیا حرج ہے؟ قانون سے چھپ کر کسی کی عصمت دری سے اگر اس کی درندگی کی تسکین ہوتی ہے تو پھر اس میں کیا رکاوٹ ہے؟ اپنی خواہش کی تسکین کے لیے سو بچوں کو اغوا کر کے، ان سے زیادتی کر کے، انھیں قتل کر کے تیزاب میں گلا سڑا دینے میں آخر کیا قباحت ہے؟ اپنے یتیم بھتیجے کا مال ہڑپ کر جانے سے آخر کیا فرق پڑتا ہے؟ جھوٹا کلیم داخل کر کے اگر اسے اچھی خاصی جائیداد مل سکتی ہے تو وہ ایسا کیوں نہ کرے؟ کسی کو اپنی گاڑی کے نیچے کچلنے کے بعد اسے ہسپتال تک پہنچا کر اپنا وقت برباد کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟ جائیداد کو تقسیم ہونے سے بچانے کے لیے اگر کوئی اپنی بہن یا بیٹی پر کاروکاری کا الزام لگا کر اسے قتل کر دے تو کیا قیامت برپا ہو جائے گی؟ اپنے دشمنوں کی بہو بیٹیوں کو ننگا کر کے بازاروں میں گھمانے پھرانے سے اگر اس کے انتقامی جذبات سرد پڑتے ہیں تو ایسا کرنے میں کیا حرج ہے؟ اپنی لاگت کو کم کرنے کے لیے اگر وہ خوراک یا ادویات میں ملاوٹ بھی کر دے اور اس سے خواہ چند لوگ مر بھی جائیں تو کیا ہے، اس کا منافع تو بڑھ جائے گا؟ ذخیرہ اندوزی کر کے اگر کسی کے مال کی قیمتیں چڑھ سکتی ہیں تو وہ ایسا کیوں نہ کرے؟ اگر تیز رفتاری میں کسی کو مزہ آتا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے اگر اس سے کوئی ایک آدھ آدمی مر جائے یا ہمیشہ کے لیے معذور ہو جائے، اتنی enjoyment کے لیے ایک آدھ بندہ مارنا کونسا مسئلہ ہے؟ اگر کوئی کسی کے نظریات سے اختلاف کرے تو اسے گولی مارنے میں کیا قباحت ہے؟ یا پھر یہ سب نہ بھی ہو تو وہ اپنا وقت معاشرے کی خدمت میں کیوں لگائے، وہ اپنے وقت کو زیادہ سے زیادہ enjoyment کے حصول ہی میں کیوں نہ صرف کرے؟ اگر وہ اپنے جرم کو چھپا سکتا ہو تو پھر سرکاری سودوں میں کمیشن کھا کر ملک وقوم کو نقصان پہنچانے میں کیا چیز مانع ہے؟

یہ وہ مثالیں ہیں جو روزانہ ہمارے سامنے اخبارات میں آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم وحشی درندوں کے درمیان اپنی زندگی گزار رہے ہیں جن پر انسان اور مسلمان ہونے کا محض لیبل لگا ہوا ہے۔ کم وبیش اسی قسم کے واقعات دوسرے ممالک میں بھی پیش آتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ مسلم دنیا پر بھی الحاد غالب آ چکا ہے۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ مسلمان توحید، رسالت اور آخرت کا کھلم کھلا انکار کر دیں، لیکن عملی طور پر ہم ان حقیقتوں سے غافل ہو چکے ہیں۔ خدا ہے یا نہیں ہے، اس نے اپنے کسی رسول کو اس دنیا میں بھی بھیجا یا نہیں بھیجا، آخرت ہوگی یا نہیں ہوگی، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ہمارا ہر عمل پکار پکار کر ہمارے ملحد ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں قانون صرف چند بدمعاشوں ہی کو کنٹرول کر سکتا ہے اور وہ بھی تب جب ان کے جرائم منظر عام پر آجائیں۔ معاشرہ دباؤ ڈال کر صرف ان لوگوں کی اصلاح کر سکتا ہے جن کے جرائم کا انھیں علم ہو جائے، بشرطیکہ ان لوگوں کی تعداد معاشرے میں آٹے میں نمک کے برابر ہو۔ جو چیز جرائم کی شرح کو کم سے کم کرتی ہے، وہ یہی انسانی اخلاقیات کا شعور ہی تو ہے۔ یہ شعور صرف ایک غالب قوت اور اس کے سامنے جواب دہی کے تصور ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ایک ملحدانہ معاشرے میں یہ تصور کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے؟

یہ سب سے نمایاں سوال ہے جو الحاد پر کیا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ دنیا بھر کے ملحد مفکرین اور فلسفی اس اخلاقی شعور سے بے بہرہ ہوں۔ اس کے برعکس وہ خود کو اخلاق اور انسانی حقوق کے علم بردار کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے اس سوال کا پوری طرح جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک فکر آخرت کا نعم البدل یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے کے ساتھ اس وجہ سے زیادتی نہ کرے کہ جواب میں وہ بھی زیادتی کر سکتا ہے یعنی دوسرے شخص کے منفی ردعمل سے بچنے کے لیے اس سے

زیادتی نہ کی جائے۔ اگر اس اخلاقی معیار کو درست مان لیا جائے تو ایسا صرف اور صرف اس صورت میں ممکن ہے جب دونوں فریق قوت و اقتدار کے اعتبار سے بالکل مساوی درجے پر ہوں۔ ایک طاقتور شخص اگر کسی سے زیادتی کرے تو اسے جوابی ردعمل کا کیا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے؟ اگر غور کیا جائے تو دنیا بھر کے مجرم اور جرائم پیشہ افراد اسی اخلاقی ضابطے کی پیروی کرتے ہیں۔ چوری اور ڈاکے کے بعد لوٹ کا مال آپس میں بڑی دیانت داری سے تقسیم کرلیا جاتا ہے۔ جوئے میں ہاری ہوئی رقم کو بڑی شرافت سے ادا کردیا جاتا ہے۔ منشیات فروش اپنا اپنا حصہ بڑی دیانت داری سے ایک دوسرے کو ادا کرتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے دیانت دار یہ جرائم پیشہ لوگ پورے معاشرے کو تباہی کی طرف لے جارہے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں یقین ہوتا ہے کہ میرا ساتھی تو کسی طرح مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے، لیکن ایک عام آدمی نہیں۔

الحاد کے اخلاقی اثرات بڑے واضح طور پر تیسری دنیا میں تو دیکھے جاسکتے ہیں، لیکن دنیا کے ترقی یافتہ حصے میں یہ اثرات اتنے نمایاں نہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ الحاد کی تحریک کو سب سے پہلے فروغ مغرب میں حاصل ہوا، لیکن وہاں کے لوگوں کا اخلاقی معیار تیسری دنیا سے نسبتاً بہتر ہے۔ کوئی بھی فلسفہ یا نظام حیات سب سے پہلے معاشرے کے ذہین ترین لوگ تشکیل دیتے ہیں اور پھر اسے اپنی تقریر و تحریر کے ذریعے معاشرے کے ذہین طبقے میں پھیلاتے ہیں جسے عرف عام میں اشرافیہ (Elite) کہتے ہیں۔ یہی طبقہ معاشرے میں تعلیم و ابلاغ کے تمام ذرائع پر قابض ہوتا ہے۔ اس فلسفے یا نظام حیات کو قبول کرنے کے بعد اسے عوام الناس تک پہنچاتا ہے۔ عوام ہر معاملے میں اسی اشرافیہ کے تابع ہوتے ہیں، اس لیے وہ اسے دل و جان سے قبول کرلیتے ہیں۔ اہل مغرب میں الحادی نظریات کے فروغ میں جن ذہین افراد نے حصہ لیا، وہ اخلاقی اعتبار سے کوئی گرے پڑے لوگ نہ تھے۔ انھوں نے خود کو انسانی اخلاق کے علم بردار کی حیثیت سے پیش کیا۔ جدید دور میں الحاد کی تحریک نے اپنا نام Humanist رکھ لیا ہے اور وہ خود کو اخلاقیات کا چمپئن سمجھتے ہیں۔ چنانچہ کونسل فار سیکولر ہیومن ازم کے بانی پال کرٹز اپنی ایک تحریک میں لکھتے ہیں:

> ''ہمیں تیسری طرف جو جنگ لڑنا ہے، وہ انسانی اخلاقیات کی جنگ ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اخلاقی انقلاب ہی انسانیت کے مستقبل کی ضمانت دیتا ہے۔ یہی آخرت کی نجات یا جنت کے عقیدے کے بغیر انسانی زندگی کو بہتر بناتا ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اخلاقی اقدار کو مشاہدے اور دلائل کی بنیاد پر پرکھیں اور نتائج کی روشنی میں اپنی اخلاقی اقدار میں تبدیلی کرنے پر تیار رہیں۔ ہمارا طریقہ پلیبیٹری ہے، جیسا کہ "Humanist Manifesto 2000" میں زور دیا گیا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس سیارے زمین پر ہر انسان بالکل برابر حیثیت رکھتا ہے۔ اخلاق کے ساتھ ہماری Committment یہ ہے کہ عالمی برادری میں ہر فرد کو اس کے حقوق ملیں اور ہم اپنے مشترکہ گھر یعنی اس زمین کی حفاظت کریں، انسانی اخلاقیات فرد کی آزادی، پرائیویسی کے حق، انسانی آزادی اور سماجی انصاف کی ضمانت دیتے ہیں۔ اس کا تعلق پوری نسل انسانیت کی فلاح و بہبود سے ہے۔''
>
> (Paul Kurtz, The secular Humanist Prospect: In Historical Perspective, Free Inquiry Magazine, ۲۳/۴ مئی ۲۰۰۳ء)

ان فلسفیوں نے انسانی حقوق اور انسانی اخلاق کو اپنے فلسفے میں بہت اہمیت دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان ممالک کے عوا

میں اخلاقی شعور نسبتاً بہت بہتر ہے۔ وہ لوگ بالعموم جھوٹ کم بولتے ہیں، اپنے کاروبار میں بددیانتی سے اجتناب کرتے ہیں، ایک دوسرے کا استحصال کم کرتے ہیں، فرد کی آزادی کا احترام کرتے ہیں، جانوروں کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں، یتیموں اور اپاہجوں کے لیے ان کے ہاں منظم ادارے ہیں، قانون کا احترام کرتے ہیں، ان کی سوچ عموماً منطقی (Rational) ہوتی ہے، وہ عقل ودانش کی بنیاد پر اپنے نظریات کو تبدیل کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، ان کے ہاں ایک دوسرے کو مذہبی آزادی دی جاتی ہے، ایک دوسرے کا احترام کیا جاتا ہے، محض اختلاف رائے کی بنیاد پر کوئی کسی کو گولی نہیں مارتا، علم ودانش کا دور دورہ ہے، اشیا خالص ملتی ہیں اور ظلم وجبر کے خلاف آواز اٹھانے والے ادارے بہت موثر ہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ اخلاقی لحاظ سے یہ لوگ فرشتے بن گئے ہیں، بلکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ بزرگوں سے اچھا سلوک نہیں کرتے، ان کی خدمت نہیں کرتے، جنسی بے راہ روی ان کے ہاں عام ہے، ان کی اکثریت طرح طرح کے نشے میں سکون تلاش کرتی نظر آتی ہے، ان میں تشدد کا رجحان بڑھتا ہوا نظر آتا ہے اور بالخصوص ان کے اخلاقی معیارات اپنی قوم کے افراد کے لیے کچھ اور ہیں اور باقی دنیا کے لیے کچھ اور۔ نیشنلزم کا جذبہ بہت طاقتور ہونے کی وجہ سے یہ اپنی قوم کے افراد کے لیے تو ابریشم کی طرح نرم ہیں اور ہر اخلاقی اصول کی پیروی کرتے ہیں، لیکن جب معاملہ کسی دوسری قوم کے ساتھ ہو تو وہاں انسانی حقوق کے تمام سبق بھول جاتے ہیں۔ جب یہ الحادی نظریات اہل مغرب سے نکل کر مشرقی قوموں میں آئے تو اشرافیہ کے جس طبقے نے انھیں قبول کیا، بدقسمتی سے اس کی اخلاقی حالت نہایت پست تھی۔ جب یہ طبقہ اور اس کے زیر اثر عوام الناس عملی اعتبار سے الحاد کی طرف مائل ہوئے تو انھوں نے تمام اخلاقی حدود کو پھلانگ کر وحشت اور درندگی کی بدترین داستانیں رقم کیں۔ دور جدید میں اس کا اندازہ محض روزانہ اخبار پڑھنے ہی سے ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ملحدین میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں، وہ تو انھوں نے پوری طرح اختیار کر لیں، لیکن ان کی خوبیوں کا عشر عشیر بھی ان کے حصے میں نہ آیا۔

الحاد کے معاشرتی اثرات میں ایک بڑا واضح اثر خاندانی نظام کا خاتمہ اور فری سیکس کا فروغ ہے۔ جنسی زندگی سے متعلق آداب انسان کو انبیائے کرام علیہم السلام ہی نے بتائے ہیں اور اس ضمن میں ہر قسم کی بے راہ روی کا خاتمہ کیا ہے۔ جب ایک شخص انھی کا انکار کر دے تو پھر اس کی راہ میں ایسی کون سی رکاوٹ ہے جو اسے دنیا کی کسی بھی عورت سے آزادانہ صنفی تعلقات سے روک سکے۔

معاشرتی اور معاشی اعتبار سے الحاد نے مسلم معاشروں کو جس اعتبار سے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، وہ دنیا پرستی کا فروغ ہے۔ دنیا پرستی کا فلسفہ مغربی اور مسلم، دونوں علاقوں میں پوری آب وتاب کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ جب انسان عملی اعتبار سے آخرت کی زندگی کا انکار کر دے یعنی اس کے تقاضوں کو مکمل طور پر فراموش کر دے تو پھر دنیاوی زندگی کی اس کی سرگرمیوں کا مطمح نظر بن جاتی ہے۔ مغربی معاشروں پر تو کسی تبصرے کی ضرورت نہیں، لیکن ہمارے اپنے معاشروں میں جس طرح دنیا پرستی کی بھیڑ چال شروع ہو چکی ہے، وہ ہماری پستی کی انتہا ہے۔ ایک طرف تو ایسے لوگ ہیں جن کی اخلاقی تربیت بہت ناقص ہے اور وہ ہر طرح کے جرائم میں مبتلا ہیں، لیکن ان کے برعکس ایسے لوگ جن کی اخلاقی قدریں کافی حد تک قائم ہیں، دنیا پرستی کے مرض میں کس حد تک مبتلا ہو چکے ہیں، اس کا اندازہ صرف ان کی چوبیس گھنٹے کی مصروفیات سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہمارے عام تعلیم یافتہ لوگ جن کی اخلاقی سطح معاشرے کے عام افراد سے بلند ہے، روزانہ صبح اٹھتے ہیں اور اپنے

کاروبار یا دفاتر کی طرف چلے جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو دفتری اوقات کے فوراً بعد واپس آجاتے ہوں۔ زیادہ سے زیادہ ترقی کے لیے لیٹ سٹنگز کا رجحان بڑھتا جارہا ہے اور عام طور پر لوگ آٹھ نو بجے تک دفتر سے اٹھتے ہیں۔ اس کے بعد گھر واپس آکر کھانا کھانے، ٹی وی دیکھنے اور اہل خانہ سے کچھ گفتگو کرنے میں گیارہ بارہ بڑے آرام سے بج جاتے ہیں۔ سوتے سوتے ایک یا دو بج جاتے ہیں۔ بالعموم صبح کی نماز چھوڑ کر لوگ سات بجے تک بیدار ہوتے ہیں اور پھر دفتر کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ چھٹی کا دن عموماً ہفتے بھر کی نیند پوری کرتے اور گھریلو مسائل میں نکل جاتا ہے۔ اب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ ہم اللہ کو راضی کرنے، دین سیکھنے، اپنی اخلاقی حالت بلند کرنے اور دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے کتنا وقت نکال سکتے ہیں؟ افسوس ہے کہ اس ترقی کو حاصل کرنے کے لیے جو زیادہ سے زیادہ بیس پچیس سال تک کام دے گی، ہم لامحدود سالوں پر محیط آخرت کی زندگی کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی اپنے کاروبار میں بیس روپے منافع کمانے کی دھن میں اربوں روپے کے سرمائے کا نقصان کرلے یا پھر دریا کی تہ میں پڑے ہوئے ایک روپے کے سکے کو حاصل کرنے کے لیے لاکھوں روپے کی دولت پھینک کر دریا میں چھلانگ لگا دے۔

الحاد کی سائنسی اساسات کا انہدام: انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے نصف اول کا زمانہ الحاد کے عروج کا دور ہے۔ اسی دور میں وہ سائنسی تحقیقات ہوئیں جنھوں نے الحادی نظریات کی توجیہ پیش کی۔ اسی دور میں الحادی نظریات اور نظام ہائے حیات کو دنیا بھر میں فروغ ملا، اسی عرصے کے دوران دنیا بھر کے انسانوں نے اپنی زندگیوں میں مختلف درجوں پر الحاد کو قبول کیا۔ کوئی الحاد کو نظریاتی طور پر بھی مان کر خالص ملحد اور دہریہ بنا اور کسی نے صرف اس کے عملی اثرات کو قبول کرنے پر اکتفا کیا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر سے الحاد کا زوال شروع ہوا۔ دور قدیم کے ملحدین کے پاس الحاد کی کوئی ٹھوس منطقی دلیل نہیں ہوا کرتی تھی۔ انیسویں صدی میں کچھ ایسے سائنسی نظریات وجود میں آئے جنھوں نے الحاد کو کسی حد تک سپورٹ کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں کسی کی حیثیت بھی سائنسی Law یا مسلمہ قانون کی نہیں تھی۔ یہ سب کے سب ابھی نظریے (Theory) کے درجے پر تھے۔ ان نظریات کا ایک مختصر جائزہ ہم پیش کر چکے ہیں، یہاں ہم ہارون یحییٰ کے مضمون The Fall of Atheism سے ان سائنسی تحقیقات کا اجمالاً ذکر کریں گے جنھوں نے الحاد کی ان سائنسی بنیادوں کو منہدم کیا۔ ان نظریات میں ڈارون کا نظریۂ ارتقا فرائڈ کا نظریۂ جنس، مارکس اور انجلز کے معاشی نظریات اور ڈرخم کے عمرانی نظریات شامل ہیں۔ جو صاحب ان کی تفصیل جاننا چاہیں، وہ اس آرٹیکل کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ یہ آرٹیکل ان کی ویب سائٹ www.hyahya.org پر بھی میسر ہے۔ ان سائنسی اساسات کے انہدام پر جارج واشنگٹن یونی ورسٹی کے پروفیسر پیٹرک گلائن کا تبصرہ بڑا معنی خیز ہے:

> ''پچھلے دو عشروں کی ریسرچ نے جدید سیکولر اور ملحد مفکرین کی پچھلی نسل کے تمام مفروضات اور پیش گوئیوں کو گرا کر رکھ دیا ہے جو انھوں نے خدا کے وجود کے بارے میں قائم کیے تھے۔ جدید (ملحد) مفکرین نے یہ فرض کر رکھا تھا کہ سائنس پر مزید تحقیقات اس کائنات کو بے ترتیب (Random) اور میکانکی ثابت کردیں گی، لیکن اس کے برعکس جدید سائنسی تحقیقات نے کائنات کو غیر متوقع طور پر ایسا منظم نظام ثابت کیا ہے جو کہ ایک ماسٹر ڈیزائن کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہو۔ ماڈرن (ملحد) ماہرین نفسیات یہ پیش گوئی کر رہے تھے کہ مذہب محض ایک دماغی خلل یا نفسیاتی

بیماری ثابت ہو جائے گا، لیکن انسان کا مذہب کے ساتھ تعلق مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں دماغی صحت کا اعلیٰ ترین نمونہ ثابت ہوا ہے۔ اس حقیقت کو ابھی صرف چند لوگ ہی تسلیم کر رہے ہیں، لیکن یہ بات اب واضح ہو جانی چاہیے کہ مذہب اور سائنس میں ایک صدی کی بحث کے بعد اب پانسا مذہب کے حق میں پلٹ چکا ہے۔ ڈارون کے نظریے کے فروغ کے دور میں، ملحدین اور متشککین جیسے ہکسلے اور رسل یہ کہہ سکتے تھے کہ زندگی اتفاقی طور پر وجود میں آئی اور کائنات محض ایک اتفاق ہی سے بنی۔ اب بھی بہت سے سائنس دان اور دانش ور اسی نقطۂ نظر کو مانتے ہیں، لیکن وہ اس کے دفاع میں اب بے تکی باتیں کرنے پر ہی مجبور ہیں۔ آج حقائق کے مضبوط اعداد و شمار یہی ثابت کرتے ہیں کہ خدا کے موجود ہونے کا نظریہ ہی درست ہے۔"

(Patrick Glynn, God: The Evidence, The Reconciliation of Faith and Reason in a Postsecular World, Prima Publishing, California, 1997, ۱۹۔۲۰،۵۳)

اب تک دنیا میں یہ مانا جارہا تھا کہ یہ کائنات ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس نظریے کو جدید دنیا میں جرمن فلسفی عمانویل کانٹ نے پیش کیا۔ یہ سمجھا جانے لگا کہ اس کائنات کو کسی نے تخلیق نہیں کیا، بلکہ یہ ہمیشہ سے ایسے ہی ہے۔ بیسویں صدی میں فلکیات (Astronomy) کے میدان میں جدید علمی تحقیقات نے اس نظریے کو غلط ثابت کر دیا۔ ۱۹۲۹ء میں امریکی ماہر فلکیات ایڈون ہبل نے دریافت کیا کہ کہکشائیں مسلسل ایک دوسرے سے دور ہو رہی ہیں۔ اس سے سائنس دانوں نے یہ اخذ کیا کہ ماضی میں کسی وقت یہ کہکشائیں اکٹھی تھیں۔ اس وقت یہ کائنات توانائی کے ایک بہت بڑے گولے کی شکل میں موجود تھیں جو ایک بہت عظیم دھماکے (Big Bang) کے نتیجے میں مادے کی صورت اختیار کر گیا۔ ملحد مفکرین نے اس نظریے کو ماننے سے انکار کر دیا، لیکن مزید سائنسی تحقیقات نے اس نظریے کو تقویت دی۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں دو سائنس دانوں ارنو پینز یاز اور رابرٹ ولسن نے دھماکے کے نتیجے میں بننے والی Cosmic Background Radiation کو دریافت کیا۔ اس مشاہدے کی تصدیق ۱۹۹۰ء میں Cosmic Background Explorer Satellite کے ذریعے سے کی گئی۔ اس صورت حال میں انتھونی فلیو جو کہ یونی ورسٹی آف ریڈنگ میں فلسفے کے ایک ملحد پروفیسر ہیں، کہتے ہیں:

"اعتراف روح کے لیے اچھی چیز ہے۔ میں اس اعتراف سے آغاز کرتا ہوں کہ علم فلکیات میں اس اتفاق رائے سے ایک ملحد کے نظریات پر زد پڑتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ فلکیات دان اس بات کو سائنسی طور پر ثابت کرنا چاہتے ہیں جو سینٹ تھامس فلسفیانہ طور پر ثابت نہ کر سکے یعنی یہ کہ اس کائنات کی کوئی ابتدا ہے۔ اس سے پہلے ہم یہ اطمینان رکھتے تھے کہ اس کائنات کی نہ تو کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی اختتام...... اب یہ کہنا بگ بینگ تھیوری کے سامنے آسان نہیں۔"

(Henry Margenau, Roy Abraham Vargesse, Cosmos, Bios, Theos, La Salle IL: Open Court Publishing 1992, ۲۴۱)

جان میڈکس نے جو کہ ایک ملحد ہیں اور 'Nature' کے نام سے رسالہ نکالتے ہیں، اس نظریے کو اس بنیاد پر رد کر دیا کہ اس سے خدا کو ماننے والوں کو حجت مل جائے گی۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یہ نظریہ دس سال سے زیادہ نہیں چل سکے گا، لیکن مزید تحقیقات نے اس نظریے کو اور تقویت دی۔ برطانوی ملحد اور ماہر طبیعات ایچ پی لپسن لکھتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ قابل قبول تشریح یہی ہے کہ اس کائنات کو تخلیق کیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ملحدین کی زبان بند کر دے گی جیسا کہ میرے ساتھ ہوا، لیکن ہمیں کسی چیز کو صرف اس بنیاد پر رد نہیں کر دینا چاہیے کہ ہم اسے پسند نہیں کرتے اگرچہ تجربہ اور مشاہدہ اسے ثابت کر رہا ہو۔''

(H.P.Lipson, "A Physicist Looks at Evolution", Physics Bulletin, 1980,۱۳۸/۱۳۸)

کائنات کے متعلق اہل الحاد کا ایک اور نظریہ بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ یہ کائنات بے ترتیب (Random) ہے۔ اس میں موجود مادے، اجرام فلکی اور جن قوانین کے تحت یہ چل رہے ہیں، ان کا کوئی مقصد نہیں، بلکہ یہ محض اتفاق ہی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں سائنس دانوں نے یہ دریافت کیا کہ کائنات میں ایسا توازن (Balance) پایا جاتا ہے جس میں اگر ذرا سا بھی ہیر پھیر ہو تو اس میں انسانی زندگی ممکن ہی نہ ہو سکے۔ تمام طبیعی، کیمیائی اور حیاتیاتی قوانین، کشش ثقل اور مقناطیسی قوتیں، ایٹمز اور مالیکیولز کی ساخت، عناصر اور مرکبات کی موجودگی یہ سب کا سب بالکل اسی طرح اس کائنات میں موجود ہے جیسا کہ انسانی زندگی کی ضرورت ہے۔ سائنس دانوں نے اس غیر معمولی ڈیزائن کو 'Anthropic Principle' کا نام دیا۔ ان کے مطابق اگر بگ بینگ کے وقت دھماکے کی شدت، مادے کے پھیلنے کی رفتار میں ذرا سا بھی فرق پڑ جاتا تو یا تو مادہ دوبارہ جڑ جاتا یا پھر اتنا زیادہ پھیل جاتا کہ موجودہ حالت میں کسی طور پر آ ہی نہ سکتا، اس طرح انسانی زندگی کبھی ممکن نہ ہوتی۔ زمین کا سائز، سورج کا سائز، سورج اور زمین کا فاصلہ، پانی کی طبعی اور کیمیائی خصوصیات، سورج کی شعاعوں کے طول موج (Wavelength)، زمین کی فضا میں موجود گیسیں اور کشش ثقل سب کی سب اسی تناسب میں موجود ہیں جو انسانی زندگی کے لیے ہونا چاہیے تھا۔ اگر اس میں کسی میں $1/10^{39}$ کے برابر بھی فرق پڑ جاتا تو انسانی زندگی ممکن نہ ہوتی۔ کیا ایسا کسی مافوق الفطرت ہستی کی مداخلت کے بغیر ممکن تھا۔ کیا دنیا میں کبھی ایسا ہوا ہے کہ ہوا میں ریت، بجری اور سیمنٹ کو یونہی اچھال دیا جائے اور وہ جب زمین پر بیٹھے تو ایک خوب صورت بنگلے کی صورت اختیار کر جائے جو انسانی رہائش کے لیے موزوں ترین ہو یا پھر روشنائی کے قطروں کو اچھال دیا جائے اور جب وہ نیچے گریں تو غالب کی غزل لکھی ہوئی ہو۔ شاید ایسا صرف کارٹون فلموں ہی میں ممکن ہے، لیکن حقیقی دنیا میں اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک منظم نتیجہ حاصل کرنے کے لیے کسی برتر ہستی کی موجودگی ضروری ہوا کرتی ہے۔ ان حقائق نے بہت سے سائنس دانوں جیسے پال ڈیوس، ڈبلیو پریس، جارج گرین اسٹائن اور مالیکیولر بائیولوجسٹ مائیکل ڈینٹن کو کسی برتر ہستی کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ الحاد کو سب سے زیادہ سپورٹ ڈارون کے نظریہ ارتقا سے ملی ہے۔ ڈارون کے مطابق تمام جان دار اشیا بے جان مادے سے ایک ارتقائی عمل کے تحت بنی ہیں۔ سب سے پہلے ایک خلیے پر مشتمل سادہ جان دار وجود میں آئے اور پھر یہ لاکھوں سال میں نسل در نسل ارتقا پذیر ہو کر اعلیٰ جانوروں کی شکل اختیار کرتے گئے۔ بیسویں صدی میں پہلی

انثالوجی کے میدان میں قدیم ترین فوسلز پر ریسرچ سے نظریۂ ارتقا کسی طرح بھی ثابت نہ ہوسکا۔ یہ ریسرچ محض دو جانوروں کے درمیان ارتقائی کڑیوں کو جوڑنے میں ناکام رہی۔ اسی طرح جانوروں کی نسلوں میں کئی عشروں تک تبدیلیوں کے مطالعے سے سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی بھی نوع (Specie) میں تبدیلیاں مخصوص جینیاتی حدود (Genetic Boundries) سے باہر نہیں جاتیں۔ انسانی آنکھ سے لے کر پرندوں کے پروں تک کسی بھی جان دار کے جسم کا ہر حصہ اتنی پیچیدہ ٹیکنالوجی (Sophisticated Technology) سے بنا ہوتا ہے کہ اس کا تقابل کسی بھی جدید مشینری سے کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے یہ ماننا بہت مشکل ہے کہ یہ سب کچھ محض اتفاق ہی سے اندھے قوانین کے تحت بن گیا۔ ان تمام تحقیقات کے نتیجے میں اب مغربی سائنس دانوں میں (Intelligent Design) کا نظریہ فروغ پا رہا ہے۔

نفسیات کے میدان میں الحاد کی اساسات سگمنڈ فرائڈ کے نظریات پر قائم تھیں جو کہ آسٹریا کے ماہر نفسیات تھے۔ فرائڈ مذہب کو محض ایک نفسیاتی بیماری قرار دیتے تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان جیسے جیسے ترقی کرے گا، یہ مرض دور ہوجائے گا۔ ماہرین نفسیات میں الحاد بہت تیزی سے پھیلا۔ ۱۹۷۲ء میں امریکن سائیکالوجی ایسوسی ایشن کے ممبرز کے مابین ایک سروے کے مطابق ماہرین نفسیات میں صرف ایک اعشاریہ ایک فی صد ایسے تھے جو کسی مذہب پر یقین رکھتے ہوں۔ انھی ماہرین نفسیات نے طویل عرصے تک لوگوں کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد جو رائے قائم کی، وہ پیٹرک گلائن کے الفاظ میں کچھ یوں تھی:

> ''نفسیات کے میدان میں پچیس سالہ ریسرچ نے یہ ظاہر کیا ہے کہ فرائڈ اور ان کے پیروکاروں کے خیال کے برعکس، مذہب پر ایمان ذہنی صحت اور خوشی کے اہم ترین اسباب میں سے ایک ہے۔ ریسرچ پر ریسرچ یہ ثابت کرتی ہے کہ مذہب پر ایمان اور اس پر عمل انسان کو بہت سے غیر صحت مندانہ رویوں جیسے خودکشی، منشیات کے استعمال، طلاق، ڈپریشن اور شادی کے بعد جنسی عدم تسکین سے بچاتا ہے۔ مختصراً، مشاہداتی ڈیٹا پہلے سے فرض کردہ سائیکوتھیراپیک اجماع سے بالکل مختلف نتائج پیش کرتا ہے۔''
>
> (Partrick Glynn, God: The Evidence, The Reconciliation of Faith and Reason in a Postsecular World, Prima Publishing, California, 1997, ٦٠-٦١)

معاشیات کے میدان میں الحاد کی سب سے بڑی شکست کمیونزم کا زوال ہے۔ کمیونزم جو دنیا میں الحاد کا سب سے بڑا داعی تھا، بالآخر اپنے دو بنیادی مراکز روس اور چین میں دم توڑ گیا۔ لینن نے اپنے تئیں خدا کو سوویت یونین سے نکال دیا تھا، لیکن خدا نے اس کے غرور کا خاتمہ کر ہی دیا۔ کمیونزم کے آخری دور میں روسی عوام اور آخری صدر گورباچوف کو خدا کی ضرورت بری طرح محسوس ہوئی۔ سیاسیات کے باب میں الحاد کی بنیاد پر بننے والے نظریات فاشزم وغیرہ بھی دم توڑ گئے۔ معاشریات یا عمرانیات (Sociology) کے اعتبار سے الحاد اہل مغرب کو سکون فراہم کرنے میں ناکام رہا۔ یہ بے سکونی اس قدر بڑھی کہ وہاں ہپی تحریک نے فروغ پایا جو دنیا کی ذمہ داریوں سے جان چھڑا کر منشیات کے نشے میں مست پڑے رہتے اور سکون کی تلاش میں سرگرداں رہتے حتیٰ کہ بعض تو اسی حالت میں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے۔

یہ چند مثالیں ہیں جو بیسویں صدی کی جدید سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں الحادی نظریات کی تردید میں آپ کے سامنے پیش کی گئیں۔ ان میں سے اگر صرف کائنات کے توازن اور اس کے عین انسانی ضروریات کے مطابق ہونے ہی کو لیا جائے تو خدا کے وجود کا معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس میں بعض چیزیں تو اتنی بدیہی ہیں کہ ان کو جاننے کے لیے کسی سائنسی تحقیق کی ضرورت نہیں، بلکہ دیہات میں رہنے والے عام انسان بھی ان کو سوچ اور سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں تفصیلی سائنسی دلائل کے بجائے بالعموم ایسی چیزوں سے استدلال کیا گیا ہے جو ہر دور اور ہر ذہنی سطح کے لوگوں کی سمجھ میں آجائیں۔ دور جدید میں کائنات کا علم یعنی فلکیات ہو یا انسان کی اپنی ذات کا علم یعنی حیاتیات و نفسیات، جیسے جیسے انسان پر حقائق منکشف ہو رہے ہیں، وہ جانتا جا رہا ہے کہ واقعی اس کائنات کا خدا اور اس کا کلام حق ہے:

سنريهم آيتنا في الآفاق وفي أنفسهم حتى يتبين لهم أنه الحق (حم السجدہ ۴۱:۵۳) ''ہم عنقریب انھیں (انسانوں کو) اس کائنات اور خود ان کی ذات (جسم و روح) میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ (قرآن) حق ہے۔''

اس موقع پر ہم یہ عرض کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ اثبات خدا سے متعلق سائنسی دلائل دیتے ہوئے ہمیں صرف ان چیزوں سے استدلال کرنا چاہیے جن کی حیثیت سائنس میں حتمی قانون (Law) یا مسلمات کی ہو۔ اگر ہم بھی ملحدین کی طرح محض سائنسی نظریات (Theories) سے استدلال کرنے لگیں گے تو عین ممکن ہے کہ کل وہ نظریات بھی غلط ثابت ہو جائیں اور ہمارا استدلال غلط قرار پائے۔

الحاد، اکیسویں صدی اور ہماری ذمہ داریاں: جیسا کہ ہم نے مطالعہ کیا کہ انیسویں صدی میں جب سائنسی علوم نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ انسان ان کی بنیاد پر کوئی حتمی رائے قائم کر سکتا، بعض خام سائنسی نظریات نے ملحدین کو خدا کا انکار کرنے کا جواز عطا کیا۔ بیسویں صدی میں جب انسان کی علمی سطح بلند ہوئی تو اسے اپنے نظریات کی غلطی کا علم ہوا۔ بہت سے ایسے حقانیت پسند ملحد مفکرین اور سائنس دانوں، جن میں پیٹرک گلائن بھی شامل ہیں، نے خدا کا اقرار کر لیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظریاتی میدان میں اب الحاد کو شکست حاصل ہو چکی ہے۔ لیکن عملی میدان میں الحاد اب بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ موجود ہے اور اس ضمن میں مغربی اور مسلم دنیا کی کوئی تخصیص نہیں، بلکہ مغربی دنیا میں تو پھر بھی اخلاقی اصولوں کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، لیکن اس کے برعکس مسلم دنیا اخلاقی اعتبار سے بہت پیچھے ہے۔

اگر غور کیا جائے تو موجودہ دور میں صورت حال اتنی مایوس کن بھی نہیں ہے۔ ہمارے معاشروں میں تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ دین کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور بالخصوص ذہین لوگ بڑی کثیر تعداد میں دین کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ افراد کی اخلاقی حالت بھی بالعموم غیر تعلیم یافتہ افراد سے نسبتاً خاصی بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ اہل مغرب میں بھی دوبارہ خدا کی طرف رجوع کرنے کا رجحان موجود ہے۔ یہ بات بعید از قیاس نہ ہوگی کہ جس طرح بیسویں صدی میں الحاد کو نظریاتی میدان میں شکست ہوئی، اسی طرح اکیسویں صدی میں انشاء اللہ الحاد کو عملی میدان میں بھی شکست ہونے کا خاصا امکان موجود ہے۔ اس ضمن میں جو لوگ اللہ، رسول اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، ان پر بھی چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اگر اہل ایمان ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو جاتے ہیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ عمل کے میدان میں بھی الحاد کو شکست ہوگی۔

اہل ایمان کو سب سے پہلے اپنا ہدف متعین کر لینا چاہیے۔ اس وقت جو لوگ دین کی خدمت کر رہے ہیں، ان کا ہدف بالعموم اتنا جامع اور متعین نہیں ہے۔ عام علما اپنے روایتی ورثے کی حفاظت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بعض دینی جماعتوں نے اپنا ہدف سیاسی نظام کی تبدیلی تک محدود کر لیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سیاسی نظام کی تبدیلی کے بعد کے مسائل پر کسی نے غور کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس کے لیے کوئی متعین لائحہ عمل (Specific Action Plan) تیار کرنے کی کسی نے زحمت کی ہے۔ اگر یہ لوگ اسلام کی بنیاد پر دور جدید کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی ماڈلز تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ موجودہ حکمرانوں میں سے کوئی انہیں نافذ کرنے پر تیار ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو کسی دوسرے مذاہب سے اتنا بڑا خطرہ لاحق نہیں ہے جتنا کہ الحاد سے جو دنیا پرستی اور اخلاقی انحطاط کی صورت میں ملت اسلامیہ کے قلب میں جڑ پکڑ چکا ہے۔ آج کی ہر دینی جدوجہد کا بنیادی ہدف اس الحاد کی جڑ پر تیشہ چلانا ہونا چاہیے۔

یہ حقیقت بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اب تک اسلام پسند افراد اور تحریکیں الحاد کی بنیاد پر قائم ہونے والے نظریات جیسے جمہوریت، سیکولرازم اور کیپٹل ازم وغیرہ کے اسلامی بنیادوں پر قائم مربوط اور ترقی یافتہ متبادل پیش نہیں کر سکے۔ اس وقت اس چیز کی ضرورت ہے کہ اسلامی تعلیمات کی اساس پر دور جدید کے تقاضوں کے مطابق قابل عمل سیاسی، معاشی اور عمرانی ماڈلز تیار کیے جائیں اور امت کے ذہین ترین افراد علوم اسلامیہ میں اجتہادی بصیرت پیدا کر کے اس عمل میں حصہ لیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کا حصول بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ پوری امت کے مزاج کو علمی اور معقولیت پسند (Rational) بنانے کی ضرورت ہے جیسا کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں اور آج کل کے اہل مغرب کا مزاج علمی اور عقلی ہے۔ تاریخ میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ جب ہم علم و دانش کی بلندیوں کو چھو رہے تھے اور اہل مغرب علم و دانش سے کوسوں دور تھے تو ہمارا دور عروج تھا اور جب ہم علم و دانش سے دور ہوئے اور اہل مغرب نے اسے اختیار کیا تو دنیا میں ان کا عروج اور ہمارا زوال شروع ہوا۔

اہم ترین ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہے کہ امت مسلمہ کے اخلاق و کردار کو بہتر بنانے کی بھی کوشش کی جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملحدین کے بجائے مسلمان خود کو عملی طور پر اعلیٰ انسانی اخلاقیات کا چمپئن ثابت کریں۔ اس ضمن میں نہ صرف یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا خود جائزہ لیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ امت مسلمہ سے باہر ہمارا کیا تاثر پایا جاتا ہے۔ اس میں کیا کیا منفی عوامل شامل ہیں؟ ہم میں ایسی کون سی حقیقی کمزوریاں موجود ہیں جو غیر مسلموں کی نظر میں ہمارے امیج کو خراب کرتی ہیں؟ کیا ہم اسلام کے حقیقی داعی اور مبلغ کا کردار ادا کر رہے ہیں یا ہماری حیثیت بھی بہت سی قوموں کے ہجوم میں محض ایک عام سی قوم کی ہے جو سب کی طرح صرف اپنے ہی حقوق کے لیے مری جا رہی ہو؟ اپنی اخلاقی کمزوریوں کو دور کر کے ایک داعی و مبلغ کا اعلیٰ ترین کردار پوری دنیا کے سامنے پیش کرنا بہت بڑا جہاد ہے جس کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں اس تنقید کا مطالعہ بہت ضروری ہے جو ملحدین اور دوسرے غیر مسلم مفکرین نے مسلمانوں کے کردار پر کی ہے۔

اگر ان خطوط پر کام کیا جائے تو امید کی جا سکتی ہے کہ ہم آنے والے دور میں الحاد کا بہتر مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ ☆☆☆